

قتال اور دین کے معاملے میں جبر و اکراہ

[”نقطہ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس

میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۸)

(گذشتہ حصے پر سہ)

قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر کی قوم کو مختلف جسمانی اور معاشی تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ متنبہ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کریں، لیکن جب وہ کوئی سبق نہیں سیکھتے تو ان پر مال و دولت اور سامان عیش کی فراوانی کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اچانک خدا کا عذاب ان پر آن پڑتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ
فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ لَعَلَّهُمْ
يَتَضَرَّعُونَ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا
تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ
لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ فَلَمَّا
نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ
كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا
أَخَذْنَاهُمْ بِغْتَةٍ فَاِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ فَقُطِعَ

”اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں کی
طرف رسول بھیجے تو انھیں جسمانی اور مالی تکلیفوں
میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ تو کیوں نہ
ایسا ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو وہ عاجزی
کرتے۔ مگر ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے
ان کے اعمال کو ان کے سامنے خوب صورت بنا دیا۔
پھر جب انھوں نے یاد دہانی کی ان باتوں کو فراموش
کر دیا جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے

نقطہ نظر

ذَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (الانعام ۶: ۴۲-۴۵)

دروازے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں، خوش ہو گئے تو ہم نے اچانک ان کو آ پکڑا اور پھر ناگہاں وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔ پھر ان لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا، جڑ کاٹ دی گئی اور تعریف کا سزاوار اللہ، جہانوں کا پروردگار ہی ہے۔“

قرآن کی رو سے عذاب الہی کے یہ واقعات عبرت کی غرض سے رونما کیے جاتے ہیں تاکہ دنیا کے باقی لوگ ان سے سبق سیکھیں اور الہی ہدایت کے انکار اور اس کو جھٹلانے سے باز رہیں، چنانچہ ان قوموں پر دنیا میں آنے والے عذاب کو وہ آخرت کے عذاب کی ایک نشانی اور یاد دہانی قرار دیتا ہے جس سے واضح ہے کہ دنیا کے عذاب کا باعث اور علت بھی وہی ہے جس کی بنیاد پر آخرت میں اہل کفر عذاب الہی کے سزاوار قرار پائیں گے:

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرْآنَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ وَذَلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ. (ہود: ۱۰۲، ۱۰۳)

”اور تیرے رب کی گرفت ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو اس وقت پکڑتا ہے جب وہ ظلم کرتی ہیں۔ بے شک اس کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہے۔ اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ یہ وہ دن ہے جب میں سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور یہ وہ دن ہے جب سب (خدا کے سامنے) حاضر ہوں گے۔“

منکرین حق کے مواخذہ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کی مذکورہ تفصیلات پیش نظر رہیں تو وہ الجھن بالکل رفع ہو جاتی ہے جس کا سامنا زیر بحث زاویہ نگاہ کو ہے، یعنی یہ کہ جب دین کے معاملے میں جبر و اکراہ درست نہیں تو پھر کفار کے خلاف قتال کا باعث ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کو کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہم نے قرآن مجید میں ان آیات کے سیاق و سباق کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے لیے مقرر کردہ کسی قانون یا اپنے اوپر عائد کردہ کسی پابندی کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ اخذ کیا جاسکے کہ وہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد ایمان نہ لانے والوں کو بھی اس دنیا میں کسی سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرائے گا، بلکہ محض اس معیار کو بیان کیا ہے جو اس کے نزدیک تکوینی سطح پر ہدایت اور ایمان کی توفیق بخشنے کے لیے شرط کی حیثیت رکھتا

ہے۔ مزید یہ کہ قرآن میں اہل حق کی ذمہ داری کو بلاغِ مبین تک محدود قرار دینے کی جو بات بیان ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان از خود اپنے اجتہاد سے کسی فرد یا گروہ کو سزا کا مستحق قرار دے کر اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ کسی فرد یا قوم پر حجت کے تمام ہو جانے اور پھر اس کے بعد اس کو عذاب کا مستحق قرار دینے کا معاملہ سرتاسر خدا کے علم اور اس کے ارادے پر منحصر ہے اور کسی انسان، حتیٰ کہ کسی قوم کی طرف مبعوث کیے جانے والے پیغمبر کو بھی اس کا اختیار حاصل نہیں۔ پیغمبر سمیت ہر داعی حق کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ حق کا پیغام بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دے، الا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ پیغمبر یا اس کے ساتھیوں کو کسی فرد یا گروہ کے خلاف اقدام کرنے کا حکم یا اجازت دے دیں۔ عذاب کے سزاوار قرار پانے والے گروہوں کی تحدید و تعیین سے لے کر ان کو دی جانے والی مہلت کے خاتمے اور ان پر سزا کے نفاذ تک کے تمام فیصلے براہِ راست بارگاہِ الہی سے صادر ہوتے ہیں جبکہ اہل ایمان اس حکم پر محض فرمانِ الہی کی تعمیل میں عمل پیرا ہوتے اور اللہ کے فیصلے کو اسی کے حکم سے اسی فرد یا گروہ پر نافذ کرنے کے پابند ہوتے ہیں جس پر نافذ کرنے کا انھیں اختیار دیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک خدائی فیصلہ ہوتا ہے جس کی تنفیذ کے لیے انسانی ہاتھ وہی کردار ادا کرتے ہیں جو تدبیر امور کے وسیع تر دائرے میں خدا کے فرشتے خدا کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ’لیس لك من الامر شئ او یتوب علیہم او یعذبہم‘ (آل عمران ۳: ۱۲۸) اور ’انما علیک البلغ وعلینا الحساب‘ (الرعد ۱۳: ۴۰) کے الفاظ میں اصولی طور پر بھی اس بات کو واضح فرمایا ہے اور منکرین حق کے خلاف قتال کے احکام کے ضمن میں بھی جگہ جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ جنگ دراصل خدا کا عذاب ہے جسے ان پر نازل کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے سپرد کی ہے۔ یہ تصریحات حسب ذیل ہیں:

مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک دعوت و تبلیغ کے بعد بھی قریش من حیث القوم آپ پر ایمان نہ لائے تو اتمامِ حجت کے بعد ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرما دیا گیا۔ تاہم بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت ان کو کلینتاً نابود کر دینے کے بجائے ایک تدریج کے ساتھ ان کے ضدی اور معاندانہ صراحت کا صفایا کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اس ضمن میں کئی دور میں ہی مشرکین کو عذابِ الہی کی ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت یہ بتادی گئی کہ اہل حق کی قوت بازو منکرین کو ان کے کفر کا مزہ چکھا دے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ
”کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ چاہے تو تم پر تمہارے
اوپر سے یا نیچے سے تم پر کوئی عذاب مسلط کر دے یا

نقطہ نظر

أَرْجِلُكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ
بَعْضُكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ انْظُرْ كَيْفَ
نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ -
وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ
لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ - لَّكُلِّ نَبِيٍّ مِّسْقَرٌ
وَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. (الانعام: ۶۵-۶۷)

تمہارے مختلف گروہ بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے
اور ایک دوسرے کی پکڑ کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم کس
کس انداز سے نشانیوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ یہ سمجھ
جائیں۔ اور تیری قوم نے اس عذاب کو جھٹلا دیا
حالانکہ اس کا آنا لازم ہے۔ تم کہہ دو کہ میں اس کو
منوانے کے لیے تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔ ہر عذاب کے
آنے کا وقت بالکل مقرر ہے اور عنقریب تم جان لو
گے۔“

یہ عذاب ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد
مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نازل ہونا شروع ہوا۔
ہجرت مدینہ کے بعد اہل کفر کے خلاف لڑائی کے باقاعدہ آغاز سے پہلے سورہ محمد میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ
جب میدان جنگ میں ان کا دشمن سے آمنہ سامنا ہو تو وہ اچھی طرح ان کی گردنیں ماریں اور پھر خوب خون ریزی
کے بعد ان کو باندھ کر قیدی بنالیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا انتقام ہوگا جو
وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کفار سے لے گا۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ
حَتَّىٰ إِذَا أَثْنَتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ
فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ
الْحَرْبُ أَوَّارَهَا ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ
لَانتَصَرْنَا مِنْهُمْ وَلَكِنْ لِّيَبْلُوَ بَعْضُكُمْ
بِبَعْضٍ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِی سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ
يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ. (محمد: ۴)

”پھر جب کفار کے ساتھ تمھاری مڈبھیڑ ہو تو خوب
ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب اچھی طرح
ان کی خون ریزی کر چکو تو انھیں مضبوط باندھ لو۔ پھر
اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دینا ہے یا فدیہ
لے کر رہا کر دینا۔ (ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو)
یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اور اگر
اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا، لیکن (اس
نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے) تاکہ وہ تم میں سے بعض
کو بعض کے ذریعے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ
میں قتل کیے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز

اکارت نہیں جانے دے گا۔“

مشرکین قریش پر یہ عذاب بالفعل غزوہ بدر میں نازل ہوا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ عذاب کے اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی لحاظ سے مداخلت کرتے ہوئے ان تمام اسباب کو ختم کر دیا جو اس معرکے کے پیاہونے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ بعض اہل ایمان کی خواہش کے برعکس، شام سے لوٹنے والے قریش کے تجارتی قافلے کے بجائے مکے سے آنے والے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کا ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا:

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحَقِّقَ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ - لِيُحَقِّقَ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ. (الانفال: ۸، ۷)

”اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا ہے کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمہارا واسطہ پڑے گا، اور تم یہ پسند کرتے تھے کہ کیل کانٹے کے بغیر آنے والا قافلہ تمہیں ملے، لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے کلمات کے ذریعے سے حق کو سر بلند کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے۔“

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ وَلَكِنْ لَيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا.

”اور اگر تم باہم طے کر کے لڑائی کے لیے نکلتے تو مقررہ وقت یا جگہ پر اکٹھے نہ پہنچتے، لیکن اللہ نے یہ اس لیے کیا کہ ایک طے شدہ فیصلے کو نافذ کر دے۔“

(الانفال ۸: ۴۲)

اسی طرح دونوں گروہوں کو میدان جنگ میں اترنے پر آمادہ کرنے کے لیے دونوں کی تعداد کو بھی ایک دوسرے کی نگاہ میں کم کر کے دکھایا گیا:

إِذْ يُرِيكُهُمُ اللَّهُ فِي مَنَايِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَأَيْتَهُمْ كَثِيرًا أَلْفَسِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ - وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ التَّفَقُّتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيَقَلِّلُكُمُ فِي أَعْيُنِهِمْ

”جب اللہ نے خواب میں تمہیں ان کی تعداد تھوڑی دکھائی۔ اگر وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تمہاری ہمت پست ہو جاتی اور تم اس معاملے میں باہم نزاع کرنے لگ جاتے، لیکن اللہ نے (تمہیں اس آزمائش سے) بچا لیا۔ بے شک وہ دلوں کی کیفیت

نقطہ نظر

لَيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ. (الانفال ۸: ۴۳، ۴۴)

کو خوب جانتا ہے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو کہ تمہارا
آمناسنا ہوا تو اللہ انہیں تمہاری نگاہوں میں تھوڑا کر
کے اور ان کی نظروں میں تمہاری تعداد کو کم کر کے دکھا
رہا تھا تاکہ اللہ اس فیصلے کو رو بہ عمل کر دے جس کو
بہر حال ہونا ہی تھا۔“

بدر کے معرکے میں قریش کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ اگرچہ عام انسانی
اخلاقیات کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کے پاس اس جنگ کا پورا پورا جواز موجود تھا، لیکن قرآن مجید نہایت اصرار کے
ساتھ اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یہ درحقیقت اللہ کا عذاب تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے نتیجے میں اہل
ایمان کے ہاتھوں قریش پر نازل کیا گیا:

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ - ذَلِكَ فَذُو قُوَّةٍ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ. (الانفال ۸: ۱۳، ۱۴)

”اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اور اس کے رسول
کے ساتھ دشمنی کی راہ اختیار کی اور جو اللہ اور اس کے
رسول کے ساتھ دشمنی کرے گا تو بے شک اللہ نہایت
سخت سزا دینے والا ہے، سو اب اس عذاب کو چکھو۔
اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بے شک منکروں کے لیے
آگ کا عذاب ہے۔“

قرآن نے اسی پہلو سے غزوہ بدر میں مشرکین کی ذلت اور رسوائی کو فرعون اور دوسرے منکرین حق پر نازل
ہونے والے عذاب کے مثل قرار دیا ہے:

كَذَّابِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (الانفال ۸: ۵۲)

”ان کا حال بھی وہی ہے جو آل فرعون اور ان سے
پہلی قوموں کا تھا۔ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تو
اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر گرفت کی،
اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

اس واقعے کے بعد اس حوالے سے قریش کو بالواسطہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنْ سَمَوَاتِكَ فَانزِلْ عَلَيْنَا مَائِطًا

”اور یاد کرو جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ، اگر یہی
دین تیری طرف سے برحق ہے تو ہم پر آسمان سے

السَّمَاءِ أَوْ اتَّيْنَا بِعَذَابٍ آلِيمٍ - وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ - وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَ هَٰ إِنَّ أَوْلِيَآؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (الانفال: ۳۲-۳۴)

پتھر برسایا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر مسلط کر دے۔ (اس سے پہلے تو) اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ تم ان کے مابین موجود تھے اور نہ اللہ انہیں اس حال ہی میں سزا دے سکتا تھا کہ وہ گناہوں کی معافی مانگ رہے ہوں۔ (لیکن اب ہجرت کے بعد) اس میں کیا رکاوٹ تھی کہ اللہ ان پر عذاب نازل کرتا، جبکہ وہ مسجد حرام سے بھی روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کی تولیت کے حقدار بھی نہیں۔ اس کے حقیقی متولی تو صرف پرہیزگار ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

قرآن مجید نے غزوہ بدر کے تناظر میں یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ چونکہ اس بات کا علم اللہ ہی کو ہے کہ منکرین میں سے کن کی صلاحیت ایمان بالکل سبب ہو چکی ہے اور کن کے حق میں ابھی ایمان لانے کا امکان موجود ہے، اس لیے قریش کے لشکر میں سے کچھ لوگ تو تہ تیغ کر دیے گئے لیکن باقی کو بچ کر واپس جانے کا موقع دیا گیا ہے:

لَيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْتَسِبُهُمْ فَيُنْقَلِبُوا خَائِبِينَ - لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ.

”تا کہ اللہ کافروں کی جماعت کے ایک حصے کو کاٹ ڈالے یا ان کو بری طرح رسوا کر دے تاکہ وہ نامراد واپس پلٹ جائیں۔ (اے پیغمبر) اس معاملے میں تمہارے پاس کوئی اختیار نہیں۔ اللہ خود ہی یا ان پر نظر عنایت کرے گا اور یا انہیں عذاب دے گا، کیونکہ یہ ظالم ہیں۔“

جہاد و قتال کے آخری مرحلے میں جب سورہ توبہ میں مشرکین کو ایمان نہ لانے پر قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو اس موقع پر بھی اس اقدام کی یہ حیثیت واضح کی گئی۔ ارشاد ہوا ہے:

فَإِنْ تَابَتْمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ آلِيمٍ. (التوبہ: ۹)

”پھر اگر تم ایمان لے آؤ تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر اس سے گریز کرو گے تو جان لو کہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے اور ان کافروں

کے ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔“

فرمایا:

”ان سے لڑو تا کہ اللہ تمہارے ہاتھوں انھیں عذاب دے اور انھیں رسوا کرے اور ان کے خلاف تمہیں فتح عطا فرمائے اور مومنوں کے دلوں کو تسکین بخشنے اور ان (کافروں) کے دلوں کے غیظ کو بھی دور کر دے۔ ہاں اللہ جس پر چاہے گا، عنایت فرمائے گا اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔“

فَاتْلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ - وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (التوبہ: ۹، ۱۴، ۱۵)

اکابر مفسرین نے بھی مشرکین عرب کے ساتھ کیے جانے والے جہاد و قتال کی تفسیر اسی مخصوص تناظر میں کی ہے۔

ابن زید فرماتے ہیں:

﴿فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ امْهَلُهُمْ رَوَيْدًا﴾ قَالَ: ”فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ امْهَلُهُمْ رَوَيْدًا“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مہلت دو اور ان کے خلاف جلدی نہ کرو۔ اللہ نے ان کو چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ جب ان سے انتقام لینا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ساتھ جہاد کرنے اور سخت رویہ اپنانے کا حکم دیا۔“

﴿فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ امْهَلُهُمْ رَوَيْدًا﴾ قَالَ: ”فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ امْهَلُهُمْ رَوَيْدًا“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مہلت دو اور ان کے خلاف جلدی نہ کرو۔ اللہ نے ان کو چھوڑے رکھا، یہاں تک کہ جب ان سے انتقام لینا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ساتھ جہاد کرنے اور سخت رویہ اپنانے کا حکم دیا۔“

امام رازی لکھتے ہیں:

”اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کے اندر موجود ہونا ان پر عذاب کے نازل ہونے میں رکاوٹ تھا تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ تم ان سے لڑو تا کہ اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب نازل کرے؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ جس عذاب کی نفی کی گئی ہے، وہ قریش کو بالکلیہ نابود کر دینے کا عذاب ہے، جبکہ جس عذاب کا حکم دیا گیا ہے،

فان قيل لما كان حضوره فيهم مانعا من نزول العذاب عليهم فكيف قال قاتلوهم يعذبهم الله بايدكم قلنا المراد من الاول عذاب الاستيصال ومن الثاني العذاب الحاصل بالمحاربة والمقاتلة.

(مفتاح الغيب، ۱۵/۱۵۸)

اس سے مراد جنگ اور قتال کے ذریعے سے حاصل ہونے والا عذاب ہے۔“

انہ تعالیٰ لما بین ما انزلہ باہل بدر من الکفار عاجلا و آجلا کما شرحناہ اتباعہ بان بین ان ہذہ طریقۃ و سنتہ فی الککل فقال کذاب آل فرعون والمعنی عادۃ ہولاء فی کفرہم کعادۃ آل فرعون فی کفرہم فجوزی ہولاء بالقتل والسبی کما جوزی اولئک بالاغراق. (۱۸۰/۱۵)

”اللہ تعالیٰ جب اس عذاب کی وضاحت کر چکے جو انہوں نے اہل بدر پر فی الفور یا بالمال نازل کیا تو اس کے بعد اب فرمایا کہ (حق کے منکر) ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ کذاب آل فرعون، جس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے بھی کفر میں وہی طریقہ اختیار کیا جو آل فرعون نے کیا تھا، اس لیے جیسے ان کو غرق کر دینے کی سزا دی گئی تھی، ان کو بھی قتل اور قید کی صورت میں سزا دی گئی ہے۔“

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

”قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان فرمائے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر و شرارت اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و عداوت میں حد سے بڑھ جاتی تھی تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل کیا جاتا تھا جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعہ خاتمہ ہو جاتا تھا۔ فکلا اخذنا بذنبہ فمنہم من ارسلنا علیہ حاصبا ومنہم من اخذتہ الصیحة ومنہم من خسفنا بہ الارض ومنہم من اغرقنا وما کان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون“ (عنکبوت رکوع ۴)

کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کے لیے عبرت ناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت و رسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لیے توبہ و رجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض و غایت یہ ہے کہ مکذبین و متعینین کو حق تعالیٰ بجائے بلا واسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص و فادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزا وہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے۔ وفادار بندوں کا نصرت و غلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر و ناتواں سمجھ کر ظلم و ستم اور استہزاء و تمسخر کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے، آج خدا کی تائید و رحمت سے انہی کے رحم و کرم یا عدل و انصاف پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کفر و باطل کی شوکت و نمائش کو دیکھ کر جو اہل حق

گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف و مظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے، جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دی کا یہ طریقہ نسبتاً زیادہ نافع ہے کیونکہ سزا پانے کے بعد بھی رجوع و توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حالات سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے، چنانچہ حضور پر نور صلعم کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے دین الہی کا حلقہ بگوش ہو گیا۔“ (تفسیر عثمانی، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”نزول توراۃ کے بعد دنیا میں ایسے غارت کے عذاب کم آئے۔ بجائے اہلاک سماوی کے جہاد کا طریقہ مشروع کر دیا گیا، کیونکہ کچھ لوگ احکام شریعت پر قائم رہا کیے۔“ (تفسیر عثمانی، ص ۵۱۹)

مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

”در حقیقت یہ اشاعت اسلام کی جدوجہد نہیں بلکہ منکرین رہنمائی کے اوپر اس خدائی فیصلہ کا ظہور تھا جس کو قرآن میں امر اللہ، حکم اللہ، وعد اللہ وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جو ”اتحاق حق“ اور ”ابطال باطل“ کے لیے ہوتا ہے۔ یہ اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے اسلام کے اصولوں کو منوانے کی کوشش نہیں تھی، بلکہ حقیقت اسلام کے اصولوں کو نہ ماننے کی سزا تھی جو زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے ایک مخصوص شکل میں ان کے اوپر نافذ کی گئی تھی۔ یہ سزا ہر اس انسان کو لازماً ملنے والی ہے جو خدا کی ہدایت کو ماننے سے انکار کر دے۔ فرق صرف یہ ہے عام انسانوں کو قیامت میں ملے گی اور رسول کے براہ راست مخاطبین کو دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔“ (ولنذیقنہم من العذاب الادینی دون العذاب الاکبر) (سجده ۲۱)

یہ صحیح ہے کہ اس فیصلہ الہی کے نفاذ سے من جملہ اور فائدوں کے، اسلام کو تبلیغی اور توسیعی فائدے بھی حاصل ہوئے، مگر یہ اس کے دیگر نتائج تھے، جس طرح ہر واقعہ کے بہت سے دیگر نتائج و اثرات ہوتے ہیں۔ جہاں تک حکم کی اصولی نوعیت کا تعلق ہے، وہ وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی۔“ (تعبیر کی غلطی، ص ۱۱۵، ۱۱۶)

قرآن مجید نے اسی پہلو سے انسانی دائرۂ اختیار کی تحدید عہد رسالت کے منافقین کے حوالے سے بھی واضح کی ہے۔ منافقین بھی منکرین حق کا ایک گروہ تھا جو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے گروہ میں شامل ہو کر درحقیقت ان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔ بظاہر ایمان لے آنے کی وجہ سے انہیں دوسرے گروہوں کے مقابلے میں زیادہ مہلت دی گئی، تاہم اصولی طور پر وہ بھی خدا کے عذاب کے مستحق تھے اور

قرآن مجید میں بار بار یہ دھمکی دی گئی کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو خدا کے قانون کے مطابق وہ بھی اہل ایمان کے ہاتھوں خدا کے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا - مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثَقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِلُوا تَفْتِيلًا. سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا. (الحزاب ۳۳: ۶۲)

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں سزا دینے کی کوئی صریح اجازت نازل نہیں ہوئی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک بطور ایک گروہ کے متحرک ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اہل ایمان قرآن کے الفاظ میں 'وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ أَوْ بَأْيُدِينَا' (توبہ ۵۲) کی کیفیت میں اس کے منتظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کب اس کی اجازت ملتی ہے۔ چنانچہ آپ کی وفات کے موقع پر سیدنا عمر کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں اسی لیے تردد پیش آیا تھا کہ منافقین کے اس گروہ پر عملاً یہ سزا بھی تک نافذ نہیں ہوئی تھی اور چونکہ اس کا فیصلہ وحی ہی کی بنیاد پر کیا جاسکتا تھا، اس لیے ان کے خیال میں منافقین کو ان کے انجام سے دوچار کیے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے جاسکتے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر کہا:

واللہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا يموت حتى يقطع ایدی
 ولسلم و لا يموت حتى يقطع ایدی
 "بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال نہیں ہوا اور
 جب تک آپ منافقین میں سے بہت کے ہاتھ پاؤں
 اناس من المنافقین کثیر وارجلهم.
 نہ کاٹ لیں، آپ کا انتقال نہیں ہو سکتا۔"
 (داری، رقم ۱۶۱۶)

اس موقع پر سیدنا عمر اور عمومی طور پر صحابہ کی جماعت کو یہی اشکال اپنی اس ذمہ داری کے حوالے سے بھی پیش آیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کر کے جزیرہ عرب سے باہر کی اقوام پر اتمام حجت کرنے کے ضمن میں ان پر عائد کی تھی۔ طبری کی روایت ہے:

لما بویع ابو بکر فی السقیفة وکان
 الغد جلس ابو بکر علی المنبر فقام
 "جب سقیفہ بنی ساعدہ میں ابو بکر کی بیعت کر لی گئی
 اور اگلے دن ہوا تو ابو بکر آ کر منبر پر بیٹھ گئے۔ ابو بکر کے
 عمر فتکلم قبل ابی بکر فحمد اللہ
 بات کرنے سے پہلے عمر اٹھے اور انہوں نے گفتگو کی۔

واثنی علیہ بما هو اہلہ ثم قال ایہا الناس انی قد کنت قلت لکم بالامس مقالة ما کانت الا عن رایہی وما وجدتها فی کتاب اللہ ولا کانت عہدا عہدہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکنی قد کنت اری ان رسول اللہ سیدبر امرنا حتی یکون آخرنا۔ (اکامل فی التاریخ ۲۱۰/۳)

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا: اے لوگو! کل میں نے تم سے ایک بات کہی تھی جو سراسر میری اپنی رائے تھی۔ نہ میں نے اس کو کتاب اللہ میں پایا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ ایسا کوئی وعدہ کیا تھا۔ بس میرا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے امور کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے اور ہم سب کے دنیا سے جانے کے بعد ہی آپ کا انتقال ہوگا۔“

ابن حبان کی روایت ہے:

اما بعد فانی قد قلت لکم امس مقالة لم تکن کما قلت وانی واللہ ما وجدتها فی کتاب انزلہ اللہ ولا فی عہد عہدہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکنی کنت ارجو ان یعیش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یدبرنا یقول حتی یکون آخرنا فاختار اللہ جل وعلا لرسولہ الذی عنده علی الذی عندکم۔

”اما بعد! میں نے کل تم سے ایک بات کہی تھی جو حقیقت میں اس طرح نہیں تھی جیسے میں نے کہی۔ بخدا میں نے وہ نہ تو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب میں پائی اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد میں جو آپ نے مجھ سے فرمایا ہو۔ البتہ مجھے یہ توقع تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے معاملات کی تدبیر کے لیے زندہ رہیں گے، یعنی ہم سب کے بعد دنیا سے رخصت ہوں گے، لیکن اللہ نے اپنے رسول کے لیے تمہارے قرب کے بجائے اپنے قرب کو پسند کیا۔“

(ابن حبان، رقم ۶۶۲۰۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۹۷۵۶)

بعد میں ایک موقع پر انھوں نے عبد اللہ بن عباس کے سامنے قرآن مجید میں اپنے اس استنباط کا ماخذ بھی بیان کیا۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں:

واللہ انی لامشی مع عمر فی خلافتہ وهو عامد الی حاجۃ له وفی یدہ الدرۃ وما معہ غیر ی قال وهو یحدث

”بخدا، ایک دن میں سیدنا عمر کی خلافت کے زمانے میں ان کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے کسی کام سے جارہے تھے اور درہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور

نفسہ ویضرب وحشی قدمہ بدرتہ
قال اذ التفت الی فقال یا بن عباس هل
تدری ما حملنی علی مقاتلی هذه
التی قلت حین توفی اللہ رسولہ؟ قال
قلت لا ادری یا امیر المومنین انت
اعلم قال واللہ ان حملنی علی ذلك
الا انی كنت اقرا هذه الآیة ﴿وَكَذَلِكَ
جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ
عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَیْكُمْ
شَهِيدًا﴾ فواللہ انی كنت لاظن ان
رسول اللہ سببقی فی امتہ حتی یشہد
علیہا بآخر اعمالہا فانہ للذی حملنی
علی ان قلت ما قلت۔
(الکامل فی التاریخ، ۲۱۱/۳)

میرے علاوہ ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ
سے باتیں کیے جاتے تھے اور اپنا درہ اپنے دائیں
پاؤں پر مارتے جاتے تھے۔ اچانک میری طرف پلٹے
اور کہنے لگے، اے ابن عباس! کیا تمہیں پتہ ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر میں
نے جو بات کہی، اس کا سبب کیا تھا؟ میں نے کہا،
اے امیر المومنین، مجھے پتہ نہیں، آپ بہتر جانتے
ہیں۔ انہوں نے کہا، بخدا! اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ
میں قرآن مجید میں جب یہ آیت پڑھتا تھا کہ
﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ
عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَیْكُمْ
شَهِيدًا﴾ تو
میں اس کا مطلب میں یہ سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم اپنی امت کے مابین موجود رہیں گے اور اس بات
کے گواہ بنیں گے کہ اس امت نے اپنی ذمہ داری کو
پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ بس یہی چیز تھی جس نے مجھے وہ
بات کہنے پر آمادہ کیا جو میں نے اس موقع پر کہی۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر یہ رویہ نہ صرف سیدنا عمر کا تھا بلکہ صحابہ کا عمومی رد عمل بھی یہی تھا۔ ابوسلمہ
بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں:

اقتحم الناس علی النبی صلی اللہ علیہ
وسلم فی بیت عائشة ینظرون الیہ
فقالوا: کیف یموت وهو شہید علینا
ونحن شہداء علی الناس فی موت ولم
یظہر علی الناس؟ لا واللہ ما مات
ولکنہ رفع کما رفع عیسیٰ بن مریم

”ام المومنین عائشہ کے حجرے میں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور
انہوں نے کہا کہ آپ کیسے انتقال کر سکتے ہیں جبکہ
آپ ہم پر گواہ ہیں اور ہمیں لوگوں پر گواہ بنایا گیا ہے؟
تو کیا لوگوں پر غلبہ قائم ہونے سے پہلے ہی آپ
وفات پا گئے؟ بخدا نہیں، آپ کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ

صلی اللہ علیہ وسلم ولیرجعن
وتوعدوا من قال انه مات ونادوا فی
حجرة عائشة وعلی الباب: لا تدفنوه
فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لم یمت. (ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲/۲۷۱)
آپ کو اسی طرح کچھ عرصے کے لیے اٹھایا گیا ہے
جیسے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اٹھایا گیا، اور آپ لازماً
واپس آئیں گے۔ اور انہوں نے ان لوگوں کو ڈانٹنا
شروع کر دیا جو کہہ رہے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا
ہے۔ انہوں نے ام المؤمنین کے حجرے میں اور
دروازے پر یہ اعلان کیا کہ آپ کو دفنانا مت، کیونکہ
آپ کا انتقال نہیں ہوا۔“

چونکہ شہادت علی الناس کے منصب کی رو سے صحابہ کرام پر دنیا کی اقوام کے سامنے حق کی گواہی دینے اور ان پر
اسلام کا غلبہ قائم کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی تھی اور یہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے مطابق ایک
مخصوص جغرافیائی دائرے میں ایک محدود مدت کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچنا تھا، اس لیے صحابہ کا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر ان پر ہجرت تمام کر دی اور شہادت علی الناس کی ذمہ
داری کو ادا کرنے کے لیے ان کے خلاف جنگ کا اقدام کرنے کی اجازت دے دی ہے، اسے خود اپنی زندگی میں اور
اپنی نگرانی میں مکمل کرائیں گے، لیکن آپ کی وفات سے یہ بات ان پر واضح ہوئی کہ ان کا یہ استنباط درست نہیں تھا۔
اس سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کو بھی منکرین حق کے خلاف قتال کا حق انسانی
دائرہ میں اختیار میں نہیں، بلکہ خدا کے دیے ہوئے اذن کے تحت خدا ہی کے نامزد کردہ گروہوں کے خلاف دیا گیا تھا
اور منکرین حق کے خلاف اقدام کے حوالے سے انسانی دائرہ اختیار کی تحدید اور خدا کے اذن کی شرط صحابہ کرام پر پوری
طرح واضح تھی۔

اوپر کی سطور میں ہم نے جو بحث کی ہے، اس سے فقہاء اور مفسرین کے اس عام نقطہ نظر کی غلطی بھی واضح ہو جاتی
ہے جس کی رو سے منکرین حق کے خلاف قتال کے احکام نازل ہونے کے بعد وہ تمام نصوص جن میں نبی صلی اللہ علیہ
وسلم کی دینی ذمہ داری کو ابلاغ و تبلیغ تک محدود قرار دیا یا محارب و غیر محارب کفار کے مابین فرق کرنے کی ہدایت کی گئی
ہے، کا عدم اور منسوخ قرار پائی ہیں اور اب اہل ایمان کی دینی و شرعی ذمہ داری کی تعین و تحدید میں ان کی کوئی اہمیت
باقی نہیں رہی۔ ہم نے واضح کیا ہے کہ یہ ہدایات عام انسانی اخلاقیات کے دائرے میں اہل ایمان کی ذمہ داری اور
اس کے حدود کا تعین کرتی ہیں اور اس دائرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان اول و آخر اسی کے پابند

تھے کہ دین کے معاملے میں کسی فرد یا گروہ تک حق کا پیغام پہنچا دینے کے بعد اس کے ساتھ جبر و اکراہ کا طریقہ ہرگز اختیار نہ کریں، نیز اہل ایمان کے دشمن گروہوں اور غیر جانب دار کفار کے مابین فرق کو ملحوظ رکھیں اور اگر کوئی گروہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے تو اس کے ساتھ بروقسط ہی کا معاملہ کیا جائے، بلکہ اگر کوئی گروہ میدان جنگ میں آجائے کہ باوجود مسلمانوں کے خلاف قتال پر آمادہ نہیں بلکہ صلح کی طرف مائل ہے تو اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ عمومی انسانی اخلاقیات کے دائرے میں ان ہدایات میں کوئی نسخہ واقع نہیں ہوا، بلکہ پوری طرح محکم اور قیامت تک کے لیے قابل عمل ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے ہاں حکم کے اس تغیر کے لیے 'نسخ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جو لفظ کے لغوی اور ظاہری مفہوم کے لحاظ سے درست ہے، لیکن اس کو متاخرین کے اصطلاحی مفہوم یعنی "حکم کے بالکلیہ ازالہ" کے اعتبار سے نسخ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ 'نسخ' کا معنی کسی حکم کو اپنی اصل اساس کے اعتبار سے کالعدم قرار دینے یا اس میں تخصیص و تحدید پیدا کر دینا ہے۔ اس اعتبار سے دین میں جبر و اکراہ کی نفی کرنے اور کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کی اجازت دینے والے نصوص 'نسخ' کے دائرے میں آتی نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ ایک اخلاقی اصول پر مبنی ہیں جن میں نسخ واقع نہیں ہو سکتا۔ یہ درحقیقت ایک مخصوص صورت حال میں ایک اخلاقی اصول پر دوسرے اخلاقی اصول کی ترجیح کا مسئلہ ہے جس سے پہلے اخلاقی اصول کے فی نفسہ کالعدم قرار پانے کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے مثال کے طور پر سیدنا حضرت نے خدا کے حکم پر ایک بے گناہ بچے کو قتل کر دیا۔ جہاں تک عام انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے، وہ اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں تھے اور سیدنا موسیٰ نے اسی بنا پر ان کے اس عمل پر اعتراض کیا تھا، لیکن خدا کی طرف سے اس لڑکے کو قتل کرنے کا حکم ملنے کے بعد ان کے لیے عام اخلاقی اصول کے بجائے خدا کے حکم کی پیروی کرنا لازم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک عمومی اخلاقی اصول کے طور پر قتل نفس کی حرمت پر کوئی زد نہیں پڑی۔ یہ حرمت اپنی جگہ پہلے کی طرح برقرار رہی اور سیدنا خضر اس لڑکے کے علاوہ دوسرے انسانوں کے حوالے سے اسی کے پابند تھے۔ بالکل یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد انکار حق پر قائم رہنے والے گروہوں کا تھا۔ عام انسانی اخلاقیات کی رو سے مسلمان ان میں سے صرف ان گروہوں کے خلاف جنگ کا اختیار رکھتے تھے جو فتنہ و فساد کے مرتکب ہوں۔ ان کے علاوہ باقی گروہوں کے خلاف انھیں کوئی اقدام کرنے کا حق حاصل نہیں تھا اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی مصلحت کے لحاظ سے ان میں سے جس گروہ کے ساتھ مصالحانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے، کر سکتے تھے بلکہ ان میں سے جو گروہ ان کے ساتھ بروقسط کا رویہ اپناتے، ان کے ساتھ بروقسط ہی کا معاملہ کرنے کے پابند بھی تھے۔ تاہم جب اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے تحت یہ فیصلہ فرمایا کہ

پیغمبر کی طرف سے حجت تمام کر دیے جانے کے باوجود جن گروہوں نے کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہے، وہ خدا کے عذاب کے مستحق ہیں جو خدا نے اہل ایمان کی تلواروں کے ذریعے سے ان پر نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اب اہل ایمان خدا کے اس فیصلے کے تحت، نہ کہ عمومی اخلاقی اصولوں کے فی فیفسہ منسوخ ہو جانے کی وجہ سے، اس کے پابند تھے کہ کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کو ختم کر کے ان کے ساتھ جنگ کریں اور ان میں جس گروہ کے لیے خدا نے قتل یا محکوم کی صورت میں جو سزا مقرر کی ہے، وہ کسی رو رعایت کے بغیر اس پر نافذ کر دیں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی قانون پر مبنی تھا جس کے مطابق وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد منکرین حق کو قتل و اسارت یا محکوم کی صورت میں ان کے کفر کی سزا دیتا ہے۔ یہ معاملہ سرتاسر اللہ کے فیصلے اور اس کے اذن پر منحصر ہوتا ہے اور اس میں کسی انسان کو اپنے تئیں کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس پر امن اور صلح جو کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کی اجازت عام انسانی اخلاقیات پر مبنی ہے اور اس دائرے میں اس میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا بلکہ وہ شریعت کے ایک محکم حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے عہد نبوی و عہد صحابہ میں جہاد و قتال کے مختلف پہلوؤں پر جو بحث کی ہے، اس کا حاصل درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ منصب رسالت پر فائز کوئی ہستی جب کسی قوم میں مبعوث کر دی جاتی ہے تو اس فیصلے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ رسول اور اس کے پیروکار اپنے مخالفوں پر بہر حال غالب آ کر رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیرہ نما عرب میں مبعوث کیا گیا تو اس سنت الہی کے مطابق یہ دو ٹوک اعلان کر دیا گیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والے تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مغلوبیت اور محکومیت مقدر ہو چکی ہے۔

۲۔ اس غلبے کے حصول کی حکمت عملی میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ جہاد و قتال، بھی ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل تھا، چنانچہ یہ ہدف ’ویکون الدین للہ‘ کے الفاظ میں آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا تھا۔ البتہ اس وعدے کا عملی ظہور دو مرحلوں میں ہوا۔ جزیرہ عرب کی حد تک تو اس دین کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غالب کر دیا گیا، چنانچہ مدنی عہد نبوت میں غلبہ دین کی جدوجہد مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد جب اپنے آخری مراحل کو پہنچی تو باطل ادیان پر دین حق کے غلبے کی دو صورتیں متعین طور پر واضح کر دی گئیں۔ مشرکین کے لیے تو لازم کیا گیا کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا، جبکہ اہل کتاب سے کہا گیا کہ وہ جزیرہ عرب کے مسلمانوں

کی محکومی اور زبردستی قبول کر لیں۔ جزیرہ عرب سے باہر روم، فارس اور مصر کی سلطنتوں تک اس غلبے کی توسیع کی ذمہ داری صحابہ کرام پر عائد کی گئی جنہیں اس مقصد کے لیے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔

۳۔ قانون رسالت کی رو سے پیغمبر کی مخاطب اقوام پر مذکورہ سنت الہی کا نفاذ خدا کے براہ راست اذن کے تحت کیا جاتا ہے اور اس میں انسانوں حتیٰ کہ پیغمبروں کے اجتہادی فیصلے کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ رسول اور اس کے پیروکاروں کا یہ غلبہ پوری دنیا کی قوموں پر نہیں، بلکہ ان مخاطبین پر ہوتا ہے جن پر اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا نافذ کرنے کا اذن مل جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین نے جو جہاد کیا، وہ غلبہ دین کے اسی وعدے کی تکمیل کے لیے اور انھی اقوام تک محدود تھا جن کے خلاف اقدام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی اور جن کی تعیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر، کر دی تھی۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کے ہاتھوں جزیرہ عرب اور روم و فارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے کے بعد غلبہ دین کے لیے جہاد و قتال کے حکم کی مدت نفاذ خود بخود ختم ہو چکی ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ ہی کا ہدف پوری دنیا پر تلوار کے سائے میں دین کا غلبہ اور حاکمیت قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کے لیے جہاد و قتال کا اقدام دین کے معاملے میں عدم اکراہ اور غیر محارب کفار کے ساتھ جنگ سے گریز کے ان عمومی اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کیا جائے گا جو قرآن مجید کے نصوص میں مذکور ہیں۔

(باقی)